© rasailojaraid.com

مستشرقین کا مطالعہ اسلام

ڈبلیو مانٹ گمری واٹ

[اپسکوپل چرچ آف سکاٹ لینڈ کے پادری، ڈبلیو مانٹ گمری واٹ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۹ء تک ایڈنبرا یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر رہے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ۔اُن کا زیر نظر مقالہ بہ زبان انگریزی "پاپائی ادارہ برائے مطالعہ اسلام و عربی" کے مجلہ *Islamochristiana* (دراسات اسلامیہ مسیحیہ) بابت ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔

پروفیسر واٹ کا یہ مقالہ بعض تحفظات کے باوجود اس لحاظ سے قابلِ غور وفکر ہے کہ ایک عیسائی پادری نے استشراق کی روایت کا جائزہ لیا ہے جس کے پروان چڑھانے میں اُس کا اپنا بڑا حصہ ہے۔ یہ مقالہ عالم اسلام اور عیسائیت کے شمارہ (جلد ۸، شمارہ ۷ (اکتوبر – دسمبر ۱۹۹۸ء) میں شائع ہو چکا ہے۔]

ایک مذہب کے اہل علم وفضل کا دوسرے مذہب کا مطالعہ کرنا، دو مذاہب کے باہم دگر عمل کا ایک اہم پہلو ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اسلام اور مسیحیت دونوں کے اہل علم کی دلچسپی زیادہ تر فریق مخالف کے مذہب کی کمزوریاں اور غلطیاں دکھانے سے تھی، تاہم مسیحی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ گزشتہ دو صدیوں میں اُن کے اہلِ علم اسلام کی مثبت قدر دانی کی جانب بڑھے ہیں، اور اس دعوے کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ خود بعض مسلمانوں کو اقرار ہے کہ اُنہیں اسلام کی عمیق تر تفہیم میں مغربی اہل علم سے مدد ملی ہے۔

استشراق کی ماہیت

چوں کہ مسیحی اور دوسرے مغربی اہل علم کو، جو اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، مستشرقین کہا جاتا ہے، اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے اولاً استشراق کی ماہیت کا جائزہ لینا مفید ہوگا۔ ''آکسفورڈ انگلش ڈکشنری'' کی رُو سے انگریزی میں پہلے پہل یہ لفظ ۱۸۱۵ء میں استعمال کیا گیا تھا، حالانکہ ''مستشرق'' اسی مماثل مفہوم میں ایک نسل پہلے استعمال میں آچکا تھا۔ استشراق، مشرق یعنی ایشیا کی تہذیبوں اور ثقافتوں کے مطالعے کا نام ہے، اور اس میں ادب، تاریخ، مذہب اور زبانوں کا مطالعہ شامل ہے۔ استشراق نہ صرف چین، ہندوستان اور اسلامی مشرق وسطیٰ کی تاحال عظیم زندہ تہذیبوں یا ان خطوں میں نسبتاً محدود تہذیبی اکائیوں سے متعلق ہے، بلکہ مصر اور وادی دجلہ وفرات کی قدیم تہذیبیں بھی اس میں شامل ہیں۔

مشرق کی ثقافتوں میں یورپ کی یہ دلچسپی اس کی خرد افروزی کے عمومی رویے کا حصہ تھی۔ روایت کے بالمقابل عقل ودانش کی اہمیت پر زور دیا جا رہا تھا۔ اس ساری فکری تحریک کا ایک اہم حصہ ایسے نئے تاریخی منہاج کی وجود پذیری تھی جس کا مقصد غیر جانبدارانہ طور پر حقائق کی تلاش تھا۔ اس کے ساتھ علم کے اُس شعبے نے جو ادبی اور متنی تنقید کے نام سے معروف تھا، کسی قدر اسی انداز میں ادبی متون کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ اسی اثناء میں یہ فکری صورت حال طبیعی علوم میں دلچسپی میں اضافہ کر رہی تھی اور اِن علوم میں نئے نئے سنگ ہائے میل بنائے جا رہے تھے۔

علومِ انسانی کے میدان میں مغربی یورپ، اور پھر بحیثیت مجموعی مغرب کے زیادہ تر اہل علم ودانش اپنی ثقافت کے مطالعے اور اگلی نسلوں تک اس کی ترسیل سے دلچسپی رکھتے تھے۔ علوم انسانی میں قدیم یونانی اور لاطینی ادب، جو یورپی ثقافت کی بنیاد خیال کیے جاتے تھے، نیز بائبل اور مسیحیت کی تاریخ شامل تھی۔ انیسویں صدی کی علمی وفکری زندگی میں مستشرقین کی حیثیت ایک چھوٹی سی اقلیت کی تھی، اور ان میں سے جو اسلام کا مطالعہ کرنے والے تھے، وہ اقلیت در اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے، کیوں کہ طویل عرصے تک اسلام کے علاوہ دوسرے اور ہندوستانی مذاہب میں دلچسپی زیادہ تھی۔ وہ مقاصد جنہوں نے لوگوں کو مستشرق بنایا، عجیب وغریب خطوں اور قوموں کے بارے میں شاید غیر معمولی درجے کا تجسس تھا، یا نامعلوم دنیاوں کی علمی دریافت کی خواہش تھی۔ انیسویں صدی کے آخری ربع میں علوم کی مختلف شاخوں کے مستشرقین نے عمومی کانگرسوں میں باہم مل بیٹھنے کو اس لیے مفید سمجھا کہ علمی دنیا میں ایک مختصر سی اقلیت ہونے کے سبب ایک ہی جیسے مسائل میں وہ ایک دوسرے کی مدد کر سکتے تھے۔ رواں صدی میں، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالخصوص ۱۹۵۰ء کے بعد، اُن اہلِ علم کی تعداد میں زیادہ اضافہ ہوا ہے جو مشرقی مطالعات میں مصروف ہیں اور مستشرقین کی عمومی کانگرسیں ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہیں، اس لیے اب علاقے، مثلاً مطالعات اسلامی و عربی، یا مضمون مثلاً تاریخ مذہب کے حوالے سے نسبتاً اختصاصی کانگرسیں ہونے لگی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں لفظ ''مستشرق'' کا استعمال متروک ہو رہا ہے، اور اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے متبادل نام ماہر اسلامیات (Islamologist) زیادہ استعمال کیا جا رہا ہے، جبکہ ماہر ہندیات (Indologist) اور ماہر چینیات (Sinologist) کی تراکیب اپنا لی گئی ہیں۔

مغربی مسیحیوں کا ابتدائی مطالعہ اسلام

بارھویں صدی کے آغاز میں، جب صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا تو مغربی یورپ میں اسلام کے بارے میں مشکل ہی سے کوئی درست معلومات تھیں، غلط فہمیاں ہی غلط فہمیاں تھیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں مطالعہ اسلام سے دلچسپی میں اضافہ ہوا، اور ہسپانوی مسیحیوں کے اندلس پر قبضے کے بعد طلیطلہ میں مسلمانوں کی موجودگی نے اُنھیں مطالعہ اسلام کے مواقع فراہم کیے۔ اُس وقت اندلس کی ثقافت مغربی یورپ کی ثقافت سے مادی طور پر برتر تھی۔ اس پس منظر میں لاطینی کے علماء کے مقاصد کا ایک حصہ یہ تھا کہ وہ اپنے ہم مذہب مسیحیوں کو بتائیں کہ وہ اندلسی ثقافت کے بارے میں بہتر رائے کیوں رکھتے ہیں، وہ متعدد پہلوؤں سے مسلمانوں سے کم تر ہیں، تاہم کم از کم مذہب میں انھیں برتری حاصل ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے اسلام کی وہ تشریح و تعبیر کی جو آج اسلام کے ''مسخ شدہ امیج'' کی حیثیت سے معروف ہے۔ ان کی تشریح و تعبیر کے مطابق اسلام ایک ایسا دین تھا جو دعوت و تبلیغ کے ذریعے نہیں، بلکہ تلوار کے زور سے پھیلا تھا، اور جو جنسی عیاشی پر مبنی تھا۔ جو مردوں کو زندگی میں چار چار شادیاں رچانے کی اجازت دیتا ہے اور آخرت میں دل پسند حوروں کے ساتھ ان کے رہنے کا وعدہ کرتا ہے۔ محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کو ایسے نظریات کا معلم بتایا گیا جنھیں وہ خود غلط سمجھتے تھے، نیز انھیں متعدد اخلاقی کمزوریوں کا حامل بتایا گیا۔

مغربی یورپ کو مسلمانوں سے جو خوف لاحق تھا، وہ ۱۴۹۲ء میں اندلس سے مسلمانوں کے حتمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انخلاء کے بعد بھی ختم نہ ہوا۔ ۱۴۵۳ء میں عثمانی سلطنت قسطنطنیہ فتح کر چکی تھی اور جنوب مشرقی یورپ کے علاقوں پر اس کا قبضہ تھا۔ ۱۵۲۹ء اور ۱۶۸۳ء میں عثمانی سلطنت نے ویانا کے خلاف حقیقی فوجی خطرے کی شکل اختیار کر لی تھی، تاہم عثمانیوں کی شکستوں اور ۱۶۹۹ء میں کارلووٹز کے معاہدے کے بعد ہی یورپیوں کے ذہن سے مسلمانوں کا خوف نکلا اور اُن میں ایک حد تک خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں اسلام کے بارے میں مغربی یورپ کے افکار پر ''اسلام کا مسخ شدہ امیج'' ہی حاوی رہا۔ کاونٹ ڈی بولین ولیرز (Count de Boulain Villiers) جیسے چند باغی صفت افراد کے علاوہ یہ بات کسی پر منکشف نہ ہوئی کہ اسلام جھوٹے مذہب کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ کاونٹ نے ۱۷۳۰ء میں لندن سے محمدؐ کی ایک سوانح عمری شائع کی جس میں مسیحیت کے بالمقابل اسلام اور محمدؐ کی تعریف کی گئی تھی، لیکن وہ ایک معمولی عالم تھے اور انہوں نے اپنی کتاب میں تخیل سے زیادہ کام لیا تھا، اس لیے اُن کی کاوش تاریخ کی کوئی سنجیدہ کتاب نہیں، بلکہ ایک رومانوی کہانی ہے۔

اسلام سے مسیحیوں کو کتنا خوف تھا، اس میں مشکل ہی سے مبالغہ کیا جاسکتا ہے۔ وینس میں قرآن کے مطبوعہ عربی متن کی اشاعت کے فوراً بعد ۱۵۳۰ء میں پوپ نے حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے۔ جب باسل میں دو پروٹسٹنٹ اہلِ علم نے قرآن کا لاطینی ترجمہ شائع کرنے کی کوشش کی تو شہر کی حکمران کونسل نے اشاعت روک دی اور دو میں سے ایک عالم کو قید کر دیا گیا، حالانکہ اس ترجمہ قرآن کے ساتھ اسلام مخالف مناظرانہ تحریریں بھی شامل تھیں۔ کونسل نے اپنے اقدام کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا تھا کہ انہیں اس طرز کی کتاب کی اشاعت سے خطرہ تھا کہ اس سے مسیحیوں کے ذہن و ضمیر پریشان ہوں گے۔ صرف اُس وقت اشاعت کی اجازت دی گئی جب پروٹسٹنٹ رہنما مارٹن لوتھر نے ذاتی طور پر مداخلت کی اور بتایا کہ مجوزہ ترجمہ قرآن کی اشاعت سے مسلمانوں کو فائدے کے بجائے کہیں زیادہ نقصان ہوگا!۔

یورپ کے لوگوں میں اسلام کے خلاف بالعموم جو سخت جذبات پائے جاتے تھے، انہیں جانے بغیر جارج سیل کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کی اہمیت نہیں سمجھی جاسکتی۔ یہ ترجمہ ۱۷۳۴ء میں لندن سے شائع ہوا تھا۔ سیل کو عربی زبان پر مکمل عبور حاصل تھا اور اس نے قرآن کی اپنی تشریح و تفسیر میں البیضاوی کی مستند تفسیر پیشِ نظر رکھی تھی۔ اس لحاظ سے اس کے ترجمے کی بڑی اہمیت ہے، اور تا حال شائع ہو رہا ہے۔ حیرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ حالیہ برسوں میں مسلمانوں نے جارج سیل کو سخت تنقیص کا نشانہ بنایا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اصل ترجمے کی ٹھوس خوبیاں دیکھنے کے بجائے مسلمان اس کے ''مقدمہ'' سے بدک گئے ہیں جو اُس نے اپنے ممکنہ مخالف قارئین کی شدتِ جذبات کم کرنے کے لیے لکھا تھا۔

نئے استشراق کی کامیابیاں

۱۸۰۰ء کے لگ بھگ سے، مشرق کے مطالعے میں مصروف تقریباً تمام افراد کے پیشِ نظر یہ تھا کہ غیر جانبداری کے ساتھ درست اطلاعات فراہم کی جائیں۔ غیر جانبداری کے اس مقصد کی جھلک جارج سیل کے ترجمے میں پہلے سے موجود تھی، کیوں کہ اُس نے کوشش کی تھی کہ قرآن کا ترجمہ صحیح صحیح اس طرح دیا جائے جیسے مسلمان سمجھتے ہیں۔ وہ یہ تک تسلیم کرنے کو تیار تھا کہ اُن لوگوں کو ''سخت دھوکہ ہوا ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ [اسلام] صرف تلوار کے زور سے پھیلا ہے (مقدمہ)''، تاہم انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے یہ ممکن نہ ہوسکا کہ اسلام کے ''مسخ شدہ امیج'' کی جگہ نسبتاً درست امیج لے سکے۔ ابتدائی اہلِ علم کو، اسلام کے بارے میں درست اطلاعات کی تلاش میں ضروری لسانی مہارت کے حصول جیسے مبتدیانہ کام میں اپنا بہت سا وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ انہیں مخطوطات تلاش کرنے، اور یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ ان میں کون سے تفصیلی مطالعے اور اشاعت کے مستحق ہیں، ان کے مندرجات پڑھ کر رائے قائم کرنا پڑتی تھی۔ جب مغربی مستشرقین نے اس کام کا آغاز کیا تو قرآن کے علاوہ، اسلام اور اسلامی تاریخ کے مطالعے کے لیے بنیادی مراجع میں سے کوئی مطبوعہ شکل میں موجود نہ تھا۔ ۱۷۸۴ء میں عثمانی حکام نے پہلی بار ترکی اور عربی میں کتابوں کی طباعت کی اجازت دی تھی، اس سے پہلے ۱۷۲۹ء اور ۱۷۴۲ء کے درمیان صرف چند کتابیں ترکی زبان میں شائع ہوئی ہیں۔

''ماہرینِ اسلامیات'' (Islamologists) نے جب عربی میں کتابوں کی طباعت شروع کی، تو اس وقت یورپ کے دوسرے فضلاء کو یونانی اور لاطینی زبانوں میں اُن کتابوں کی طباعت کا وسیع تجربہ حاصل تھا جو ہنوز خطی نسخوں کی شکل میں موجود چلی آتی تھیں۔ یہ اہلِ علم جب کسی کتاب کے چھاپنے کا فیصلہ کرتے تو حتی الوسع اس کے زیادہ سے زیادہ خطی نسخے فراہم کرتے، ان کے ایک ایک لفظ کا تقابل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے اور متن کے اختلافات کی نشان دہی کرتے تھے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کرنے کے ایسے طریقے وضع کر لیے تھے کہ دو یا اس سے زیادہ مختلف متون میں سے کون سا متن ممکنہ طور پر درست ہے، جسے حتمی متن قرار دیا جائے، تاہم جو متن وہ مسترد کرتے، یہ خیال کرتے ہوئے کہ ممکن ہے، وہی درست ہو، صفحے کے زیریں حاشیے یا کتاب کے آخر میں درج کر دیتے تھے، تاکہ دوسرے اہل علم اختلافِ متن پر خود غور کر لیں۔ مستشرقین نے عربی اور دوسری مشرقی زبانوں کی کتابوں کی ترتیب وتدوین میں یہی نہج اختیار کیا۔ اس طرح اُنہوں نے کتابیں طبع کیں اور اُن غلطیوں میں سے زیادہ تر درست کر دیں جو نقل کرتے ہوئے کاتبوں سے ہو گئی تھیں۔

ابتدائی ''ماہرینِ اسلامیات'' میں سے بہت سے بنیادی طور پر ماہرینِ لسانیات تھے۔ انہوں نے اپنے بعد آنے والے مستشرقین کی سہولت کے لیے قواعد اور لغات مرتب کیے۔ متعدد مستشرقین نے قبل از اسلام زمانے کی شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔ اس کا سبب جہاں لسانی دلچسپی تھی، وہیں قبل از اسلام کے عرب کی تصویر کشی بھی کرنا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور ترکی ادب کی تاریخیں مرتب کی گئیں۔ اصلاً ان ادبی تاریخوں میں بہت سی معروف ادبی کتابوں کی کیفیت بیان کی گئی تھی، مگر بعد ازاں اہل علم کو یہ امر ضروری محسوس ہوا کہ خطی نسخوں کی فہارس ہونا چاہییں، اور اِس ضرورت کے تحت کارل بروکلمان کی پانچ ضخیم جلدوں میں ''تاریخ ادب عربی'' سامنے آئی۔ اس کے بعد اب فواد سزگین کی زیادہ جامع ''تاریخ ادبیات عربی'' لکھی جا رہی ہے۔ ۱۷۱۴ء میں ''الف لیلہ'' کا فرانسیسی ترجمہ شائع ہو گیا تھا، اسی طرح بہت سی دوسری عربی کتابوں کے یورپی تراجم شائع ہوئے۔ ان ترجموں کے ذریعے بعض کہانیاں اُن لوگوں میں بھی رواج پا گئیں جنہیں مشرق یا اسلام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اسلام کے ابتدائی مغربی مطالعات میں قرآن کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ تمام اہل علم قرآن کو درست طور پر سمجھنا چاہتے تھے، لیکن جہاں جارج سیل نے تفاسیر سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ بعد کے مسلمانوں نے اسے کیا سمجھا، عہد حاضر کے بعض اہل علم نے اس کے برعکس یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کا مفہوم اُن لوگوں کے لیے کیا تھا جنہوں نے سب سے پہلے اس کی تلاوت سنی تھی، اور اس مقصد کے لیے انہوں نے جدید ادبی طریقہ اختیار کیا ہے۔ مغربی اہل علم اس بات کے متمنی رہے ہیں کہ اسباب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نزول کے حوالے سے بالعموم قرآنی آیات وسور کی جو ترتیب بیان کی جاتی ہے، اس سے کہیں زیادہ کامل ترتیب آیات وسور تاریخ وار مرتب کی جائے، اور ایک صدی یا اس سے زائد عرصے میں اس بارے میں اُن میں ایک حد تک اتفاق رائے پیدا ہو گیا ہے۔ متن کے اُن اختلافات پر بھی توجہ دی گئی ہے جو قراءتِ سبعہ میں تسلیم کیے گئے ہیں، یا جو مسلمان مصنفین کی کتابوں میں قبل از عہد عثمانؓ کے حوالے سے نقل کیے گئے ہیں۔ بعض مسلمانوں نے اس سرگرمی کے پہلوؤں پر اعتراض کیا ہے، لیکن اُن کے اعتراضات، بہ مشکل ہی صحیح مانے جاسکتے ہیں، کیوں کہ اختلافات کے سلسلے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس میں قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے عقیدے کے خلاف کچھ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر متن کے اختلافات (textual variants) سے یہ معلوم ہوا ہے کہ متن کی اختیار کردہ شکل میں بالعموم وزن ہے، اور ایسے کوئی اختلافات نہیں جن سے مقدّس متن کی تعلیم میں کوئی نمایاں تبدیلی ہوتی ہو۔

تاریخ کے میدان میں ماہرینِ اسلامیات نے مغربی مورخین کے طرز عمل کے مطابق قدیم ترین اور سب سے زیادہ قابلِ اعتماد دستاویزات کی تلاش وجستجو کی۔ حضرت محمدؐ کی زندگی کے لیے انہوں نے ''طبقات ابن سعد'' کے ساتھ ابن اسحاق کی ''سیرت'' اور الواقدی کی ''کتاب المغازی'' کی اہمیت پر زور دیا اور ان کتابوں کے اوّلیں عالمانہ ایڈیشن تیار کیے۔ ایک اور اہم کارنامہ الطبری کی تاریخ کے عالمانہ ایڈیشن کی تیاری تھا۔ ان اور بعض دوسرے ماخذوں پر مبنی تاریخی مطالعات سے کبھی کبھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے بارے میں متاخر مسلمانوں کے جو خیالات ہیں، وہ اسلاف کے نظریات سے مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ مسلمان آج عہد بنوامیہ کے بارے میں بالعموم جو تصور رکھتے ہیں، اور ایک حد تک یہ اسلام کا مستند تصور سمجھا جاتا ہے، اصلاً بنوعباس کے ابتدائی دور کا بنوامیہ۔مخالف پروپیگنڈا ہے، جو عہد بنوامیہ کی معاصر دستاویزات سے سامنے آنے والے حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مطالعہ حدیث کے بارے میں تاریخی نقد ونظر کے طریقے استعمال کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ مسلمان علماء نے جن بہت سی احادیث کو صحیح سمجھا ہے، واقعتاً مستند نہیں ہیں، تاہم یہ نتیجہ تسلیم کرنے سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معاملے سے تاریخیت کے معیار کا کیا تعلق ہے؟ (جیسا کہ آئندہ سطور میں ذکر کیا جائے گا)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی فرقوں کے بارے میں الشہر ستانی کی کتاب کا یورپی ایڈیشن ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا تھا اور علمی حلقوں میں اس سے کچھ اعتناء کیا گیا تھا۔ مسلمان اہل علم کی دلچسپی زیادہ تر عقائد کے بارے میں فرقوں کی غلطیاں دکھانے میں تھی، مگر مغربی اہل علم کو اسلامی مذہبی فکر کے عہد بہ عہد ارتقاء اور یہ دکھانے سے زیادہ دلچسپی تھی کہ عقیدے کی بتدریج تشریح کس طرح کی گئی ہے۔

صرف گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں ماہرینِ اسلامیات نے اسلامی دینیات/الٰہیات میں اشعریوں اور دوسروں کے الہیاتی رسائل کی جانب توجہ دی ہے۔ اس سے پہلے زیادہ تر مغربی اہل علم کے لیے ان رسائل میں کوئی کشش نہ تھی، اور بعض نے معتزلہ کی مبتدعانہ فکر کو ترجیح دی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ معتزلہ انسانی ارادے کی آزادی میں یقین رکھتے تھے۔ بہت سے مسلمانوں کے لیے مذہب کے حوالے سے بتدریج ارتقاء کا نظریہ عجیب اور پریشان کن ہے، لیکن یہ طرزِ فکر مغربی سوچ کا عمومی حصہ بن چکا ہے، اور مذہب کے ساتھ ساتھ مختلف تناظرات میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ عظیم مسلم صوفیاء کی کتابوں نے بھی بعض مغربی دانش وروں کی توجہ حاصل کی، اور جنھوں نے صوفیاء کا مطالعہ کیا، وہ اکثر اسلام کے لیے ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے، اس سلسلے میں لوئی میسی نیوں کا نام بہت ہی نمایاں ہے۔

مغرب کے کبھی ختم نہ ہونے والے تجسس نے اہلِ علم کو اسلامی ثقافت کے دوسرے پہلوؤں مثلاً فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، فلسفہ، سائنس اور قانون کی جانب توجہ دلائی۔ جو اہل علم اس طرز کے مطالعے میں لگے، اُنہیں خود اسلام سے بالعموم کوئی غرض نہ تھی، بلکہ صرف اپنے تخصیصی شعبے سے دلچسپی تھی۔ البتہ اسلامی قانون کے مطالعے کا ایک عملی پہلو تھا، کیوں کہ نو آبادیاتی طاقتوں نے اسلامی عدالتوں کا شرعی امور، بالخصوص شادی بیاہ اور خاندانی معاملات، میں فیصلے کرنے کا اختیار تسلیم کر لیا تھا۔

یہ وسیع کدو کاوش جس کے کارناموں کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے، بلاشبہ، مغرب کی تمام علمی سرگرمیوں کا محض ایک حصہ تھی۔ ان تمام علمی سرگرمیوں کا مقصد نسل انسانی کے ابتدائی سادہ تر حصے سے لے کر نہایت پیچیدہ حصے تک، ہر ایک کے بارے میں درست معلومات کا حصول تھا، حتیٰ کہ مستشرقین میں بھی انیسویں صدی میں غالباً کچھ وقت کے لیے اسلام سے زیادہ ہندوستانی روایات میں دلچسپی تھی۔ اگر کوئی پیچھے مڑ کر اسلام کے بارے میں اس علمی تحریک پر نظر ڈالے تو وہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کمزوریاں تھیں۔ دائرہ تحقیق کی وسعت کا مطلب یہ تھا کہ کوئی ایک عالم اس سب میں مہارت حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اُس سے غلطیوں کا امکان تھا جو آخرالامر دوسرے اہل علم درست کرتے۔ بعض اہل علم اپنے رویے میں مذہب دوست سے زیادہ سیکولر تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن میں سے متعدد مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے حوالے سے بے حسی کا شکار ہو گئے، وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ مقدس امور سے متعلق کام کر رہے ہیں۔ جن اہلِ قلم نے متعدد حدیثوں کے غیر مستند کردار کے بارے میں بحث کی ہے، وہ اس نکتے کے بیان میں توازن قائم کرنے میں ناکام رہے اور متاخر مسلمانوں کے فکری رویے میں حدیث نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، اسے نہیں سمجھ سکے، بالخصوص یہ حقیقت کہ حدیث اُن کے اخلاقی آئیڈیل کا ایک اظہار ہے۔

انیسویں صدی میں جب اکثر ماہرینِ اسلامیات قرون وسطیٰ سے ورثے میں حاصل کیے گئے اسلام کے امیج کے بجائے صحیح اور درست امیج بنانے میں کوشاں تھے، تو کچھ لوگوں نے باقی ماندہ اسلام مخالف تعصّبات قائم رکھے، اور اُن کے بعض علمی فیصلے ان تعصّبات سے متاثر ہوئے، اور یہ صورتِ حال بیسویں صدی کے ربع اول میں بھی موجود تھی۔ یہ بات بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ کچھ چھوٹے مسیحی گروہ جیسے پہلے تھے، اب بھی ہیں، اور یہ گروہ دینیاتی بنیادوں پر پوری شدت کے ساتھ اسلام مخالف ہیں اور ایسی کتابیں لکھتے رہتے ہیں جن میں مسلمانوں کے دین پر حملے کیے جاتے ہیں، لیکن ایسے مصنفین، مسیحی الہیات میں چاہے کتنا ہی درک کیوں نہ رکھتے ہوں، اسلامیات کے عالم نہیں، اور علمی دنیا میں اُن کا کوئی وزن نہیں۔ آج مسیحیوں کے بڑے بڑے گروہ، جن میں رومن کیتھولک بہت نمایاں ہیں، چرچ کی سطح پر مسلمانوں کو خداوند پر ایمان میں اپنا رفیق سمجھتے ہیں، اور اُن کے ساتھ مکالمہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔

بہت عرصے سے یورپ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو سرے سے مذہب کے مخالف ہیں یا مذہب کے بڑے حصے کے مخالف ہیں۔ بہت پہلے ۱۷۴۱ء میں ممتاز فرانسیسی مصنف والٹیر نے *La Fanatisme ou Mahomet le Prophete* کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا تھا جس میں حضرت محمدؐ کی ناقابلِ تسلیم تصویر پیش کی تھی، مگر وہ اصلاً اپنے معاصر کیتھولک ازم پر حملہ کر رہا تھا۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس بات کا بھی اضافہ کیا جائے کہ والٹیر نے بعد کی اپنی تحریر *Essay on Morals* میں حضرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمدؐ کو موافق روشنی میں ایک عظیم حکمران کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ بہت ہی کم مسلمان شاید اس بات سے آگاہ ہیں کہ گزشتہ چند برسوں میں مذہب مخالف لا ادریت (Scepticism) نے دوبارہ سر اٹھایا ہے اور یہ اسلام کے خلاف استعمال کی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں دو نوجوان اہل علم، پیٹریشیا کرون (Patercia Crone) اور مائیکل کک (Michael Cook) نے *Hagarism* کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں زبردست تبحرِ علمی کے ساتھ اُنہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ حضرت محمدؐ کے دور کا مذہب اسلام نہیں، بلکہ اُن کے بقول 'ہاجرزم' تھا، اور اسلام جیسا کہ آج کل معروف ہے، بہت عرصے بعد وجود میں آیا تھا۔ پیٹریشیا کرون اور مائیکل کک ایک دوسرے فاضل جان وانس برو (John Wansbrough) کے شاگرد ہیں جس نے ''مطالعہ قرآن'' پر ایک کتاب میں علمی طور پر یہ رائے دی تھی کہ بنو عباس کے ابتدائی عہد تک قرآن کا متن متعین نہیں ہوا تھا۔ مسلمان یہ جان کر اطمینان کا سانس لیں گے کہ زیادہ تر مغربی اہل علم کی رائے میں دونوں کتابوں کے دلائل میں شدید کوتاہیاں ہیں اور وہ کسی پس و پیش کے بغیر انہیں رد کر دیں گے۔

حالیہ استشراق اور مسلم ردعمل

بہت سے مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ گزشتہ صدی یا اس سے کچھ زائد عرصے کے دوران میں نہ صرف، مندرجہ بالا سطور میں مذکور طرز کے مذہب مخالف اہل علم، بلکہ اُن کے الفاظ میں مستشرقین کا عمومی طبقہ (حالانکہ وہ صحیح تر الفاظ میں ماہرین اسلامیات ہیں)، اسلام پر حملے کر رہا ہے۔ مسلمان جس بات کا احساس کرنے سے قاصر ہیں، وہ یہ ہے کہ ماہرینِ اسلامیات ادبی اور تاریخی تنقید کے اُن طریقوں سے اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں جن سے دوسرے مغربی اہلِ علم دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور یہ طریقے سب سے پہلے مسیحیت کے مطالعے میں کام میں لائے گئے تھے۔ ابتدائی دور کے بعض اہلِ علم مسیحیت کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے، اور اُنہوں نے اپنے اخذ کردہ نتائج کے منفی پہلوؤں پر زور دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ بہت سے مسیحی محسوس کرنے لگے تھے کہ اُن کے مذہب پر حملہ کیا جا رہا ہے، تاہم آخر الامر مخلص مسیحیوں نے اِن علوم میں مہارت حاصل کر لی، اور یہ دکھانے کے قابل ہو گئے کہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرز کا علم و فضل مثبت نتائج تک بھی پہنچا سکتا ہے اور ایک ایمان رکھنے والے کو اپنے مذہب کی عمیق فہم بھی دے سکتا ہے۔ مسیحیوں کو بعض تبدیلیاں تسلیم کرنا پڑیں، لیکن یہ فروعی معاملات میں تھیں، اور ان سے مذہب کے مرکزی عقائد متاثر نہیں ہوئے۔ مثال کے طور پر اب اہل علم کے نزدیک یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ''کتابِ مقدس'' کی ابتدائی کتابیں، اگرچہ حضرت موسیٰ کی کتابیں کہی جاتی ہیں، مگر یہ اُن کی کتابیں نہیں ہیں، بلکہ اِن میں ایسا لوازمہ شامل ہے جو مختلف ذرائع سے اکٹھا کیا گیا ہے اور بعد میں آنے والے مرتبین نے انہیں ترتیب دیا ہے۔ تاہم یہ امر اس حقیقت کے انکار کا سبب نہیں بن سکتا کہ ان کتابوں میں خداوند کا کلام ہے جو پہلے حضرت موسیٰ پر نازل ہوا تھا، کیوں کہ یہ بات خلافِ عقل ہے کہ خداوند مرتبین اور دوسرے افراد کو استعمال نہیں کر سکتا۔

ایسا لگتا ہے کہ ان معاملات میں مسلمانوں نے جو مشکلات محسوس کی ہیں، وہ زیادہ تر دو ذرائع سے پیدا ہوئی ہیں: علم کی ماہیت کا تصور جو انہوں نے قرونِ وسطیٰ کے اہلِ علم سے ورثے میں حاصل کیا ہے، اور اسلام کا اپنا روایتی امیج۔

۱۹۴۵ء میں سر ہملٹن گِب نے *Modern Trends in Islam* [اسلام میں جدید رجحانات] کے موضوع پر اپنے لیکچروں میں معاصر مغرب اور قرونِ وسطیٰ کے تصوراتِ علم کے درمیان کشمکش کی نشاندہی کی تھی۔

> اسلام کا قدیم تصورِ علم یہ نہیں تھا کہ نامعلوم تک پہنچا جائے، بلکہ یہ ''معلوم'' کو زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرنے کا میکانکی طریقہ تھا۔ ''معلوم'' کو بھی [مسلسل] بدلتے اور پھیلتے ہوئے نہ دیکھا گیا، بلکہ ''عطاشدہ'' اور ''حتمی'' سمجھا گیا (ص ۶۴)۔

اس کے بعد گِب نے ان نامساعد اثرات کی نشاندہی کی ہے جو اس تصوّرِ علم سے مسلمانوں کی فکری سرگرمیوں پر پڑے ہیں۔ ہمارا معاصر تصور یہ ہے کہ علم ایک لامتناہی میدان ہے جس کے بہت سے حصے تا حال دریافت نہیں ہوئے۔ شاید اسی تضاد کا اظہار یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے مسلمان اہل علم کے پیشِ نظر بنیادی طور پر ''علم روزمرہ کی زندگی کے لیے'' تھا، یعنی ''مذہبی اور اخلاقی سچائی'' [کا حصول]، جبکہ ایک جدید مغربی فاضل ''علم برائے طاقت'' کی تلاش میں ہے، کیوں کہ اہل علم اور سائنس دان جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معروضی حقائق جاننے کی کوشش کرتے ہیں، یہ فطرت کی قوتوں، نیز افراد اور انسانی گروہوں کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ سر ہملٹن گِب نے اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ تاریخی تنقید کا جو علم مسلم مورخین نے تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں پیش کیا تھا، اُس کے بعد اُن کے ہاں سے غائب ہو گیا اور

> [مؤرخین] نے اسلامی ماضی کی اُس مبنی بر عقائد تشکیل جدید کو کسی احتجاج کے بغیر قبول کر لیا جو بتدریج راسخ العقیدہ حلقوں میں جڑ پکڑ گئی تھی اور تاریخ کے جو مقاصد علماء نے متعین کیے تھے، اُن کی تائید کی اور یہ مقاصد اخلاقی تعلیم اور دینیاتی مباحثے کا ذریعے تھے۔

اس وقت مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان باہمی تفہیم میں جو سخت ترین رکاوٹیں ہیں، ان میں سے ایک غالباً تاریخ کے روایتی اسلامی تصور اور جدید مغربی تاریخ نگاری کے درمیان ٹکراؤ ہے۔ ایک مسلمان فاضل عبدالجواد فلاتوری نے جو اس ٹکراؤ سے آگاہ ہیں، مغربی تصور کے نعم البدل کے طور پر قرآنی تصورِ تاریخ کا دفاع کیا ہے، لیکن اس میں شک ہے کہ اُن کے دلائل اُن مسلمانوں کو قائل کریں گے جو مغربی مورخین کے کارناموں کے معترف ہیں۲۔ چوں کہ مسلمانوں اور مسیحیوں دونوں کا عقیدہ ہے کہ خداوند ہی ''**فعال لمایرید** '' ہے، اس لیے لگتا ہے کہ بحث اس نقطے پر مرکوز ہوگی: کیا یہ جاننا بہتر ہے کہ خداوند نے تاریخ میں واقعتہً وہی کچھ کیا جو ہمیں تاریخی تنقید کے ذریعے حاصل شدہ معروضی نتائج سے معلوم ہوا ہے، یا جو کچھ ماضی کے اہل علم نے تاریخ میں خداوند کی کارفرمائی فرض کی، اُسی کو تسلیم کر لیں۔

''ماہرینِ اسلامیات'' کے جن تصورات کا مسلمانوں کو تجربہ ہوا ہے، ان کے بارے میں مشکلات کا دوسرا ماخذ اسلام کا اپنا روایتی امیج ہے۔ یہاں متعدد نکات بیان کیے جا سکتے ہیں، لیکن صرف ایک، یعنی اسلام کے تصور کاملیت (Idea of self -sufficiency) کو دیکھ لینا کافی ہوگا۔ اس سے مراد یہ عقیدہ ہے کہ جملہ بنی نوع انسان کو آج سے لے کر قیامت تک جس مذہبی اور اخلاقی صداقت کی ضرورت ہے، وہ قرآن اور حدیث میں محفوظ حکمتِ خداوندی میں موجود ہے۔ مسلمانوں کی فتح اسکندریہ کے بارے میں ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ فاتح جرنیل نے خلیفہ عمر فاروقؓ کو لکھا کہ وہ اسکندریہ کے اس مشہور کتب خانے کے بارے میں کیا کارروائی کرے جو اسے یہاں ملا ہے۔ جرنیل کو جواب موصول ہوا: ''اگر کتابیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کی تائید کرتی ہیں، تو وہ غیر ضروری ہیں اور ضائع کی جاسکتی ہیں۔ اگر وہ قرآن کی مخالف ہیں تو وہ خطرناک ہیں اور انہیں ضائع کر دینا چاہیے۔'' جرنیل نے تمام کتابیں جلانے کے لیے دے دیں تا کہ حماموں کا پانی گرم کیا جاسکے۔ یہ کہانی قریب قریب یقیناً گھڑی ہوئی ہے، کیوں کہ یہ سوچنے کی بنیادیں موجود ہیں کہ فتح اسکندریہ سے کئی برس پہلے کتب خانہ، شہر سے منتقل کر دیا گیا تھا، لیکن کہانی میں جس رویے کا اظہار کیا گیا ہے، یہ متعدد روایت پسند مسلمانوں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وہ اسلام کے باہر فکری تحریکوں میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں سلطنتِ عثمانیہ کے علماء نے مغربی یورپ کے اُن جدید فلسفیانہ رجحانات کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کی جن کی رہنمائی دیکارت (Descartes) اور لاک (Locke) کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب سلطنتِ عثمانیہ کے سفارت کار اور طلبہ مغربی یورپ آئے تو وہ جن اہل فکر سے ملے، اُن کے اٹھائے ہوئے دینیاتی سوالوں سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ انیسویں صدی میں تاریخی اور ادبی تنقید کے جدید علوم سے مسلمانوں کا نابلد رہنا پہلے سے کہیں زیادہ تباہ کن تھا، کیوں کہ تاریخی و ادبی تنقید ہی سے وہ بہت سے تصورات وجود میں آئے ہیں جنہیں مسلمان اسلام کے خلاف حملہ خیال کرتے ہیں۔

علم کے متضاد تصورات اور اسلام کے تصورِ کاملیّت کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جہاں متعدد مغربی ماہرین اسلامیات ہیں جن سے مسلمان کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں، ان جیسے مسیحیت کے مسلمان طالب علموں کا کوئی وجود نہیں۔ ایک طرف ان ماہرینِ اسلامیات کی سیکڑوں کتابیں ہیں، حتیٰ کہ متعدد جلدوں پر مشتمل دائرۃ المعارف ہے جو صرف اسلام سے متعلق ہے، اور مسلمانوں نے ان میں سے بعض کتابوں کو عربی اور دوسری اسلامی زبانوں میں ترجمے کے قابل سمجھا ہے۔ دوسری طرف مناظرانہ نوعیت کی کتابوں کے سوا مسیحیت پر مسلمانوں کی کوئی تصنیفات نہیں۔ زیادہ سے زیادہ گزشتہ عشرے یا دو عشروں میں بعض اسلامی جامعات میں ''تقابلِ ادیان'' کا مضمون شامل کیا گیا ہے۔

چند مسلمانوں کو مغرب کے فکری زاویہ نظر کا کچھ ادراک ہے، اور اسے ایک حد تک تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس بات کی ازحد ضرورت ہے کہ مزید مسلمان یہ ادراک حاصل کریں، ورنہ مسلم امت اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لے گی، یا بقول کسے ایک ''محصور قلعے'' میں ہوگی؟ روایت پسندوں کی سوچ کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میلان یہ ہے کہ وہ مغربی صنعتی ٹیکنالوجی کی جملہ مصنوعات حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ ان کے بنانے میں حصہ لے سکتے ہیں، مگر وہ مغرب کے فکری رویوں سے متاثر نہ ہوں گے، لیکن یہ ناممکن بات ہے۔ مسلمان مغرب کے فکری رویّوں کی مبادیات سے کچھ حاصل کیے بغیر مغرب کی میکانکی مہارتیں حاصل نہیں کر سکتے، اور وہ وقت دور نہیں جب وہ اسی طرز کے سوال پوچھنے لگیں گے، جو ماہرین اسلامیات اٹھاتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ بحیثیتِ مجموعی مسلمان الگ تھلگ قلعہ بند ہونے کا تصور ترک کر دیں اور ان میں سے بعض تاریخی وادبی تنقید اور دوسرے جدید علوم میں مہارت حاصل کر لیں اور پھر اپنی نئی حاصل کردہ مہارتوں سے *Hagarism* جیسی کتابوں کے خلاف اپنے دین کا دفاع کریں، اور اپنے مسلمان بھائیوں کو بتائیں کہ اسلام کے حقیقی عقائد کس طرح مغربی فکری تصورات کے ساتھ جوڑے جا سکتے ہیں۔

حواشی

1- james Kritzeck, *Peter the Venerable and Islam*, Princeton University Press, 1964. pp. VII-VIII

۲- اینماری شمل اور اے۔ فلا طوری (مرتبین) کی کتاب *We Believe in One God*، لندن (۱۹۷۸ء) میں مقالہ "Experience of Time and History in Islam"

اعتزار: گزشتہ شمارہ (۱۹) میں صفحہ ۱۵ پر پندرہویں سطر میں ایک جملہ شائع ہونے سے رہ گیا ہے جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ براہ کرام تصحیح نوٹ فرمالیں۔ مکمل جملہ اس طرح ہے: ''المختصر القرضاوی کے خیال میں آج کی مسلم عورت تعلیم یافتہ اور فعال ہے اور اسلام کو اس کی خدمات کی اشد ضرورت ہے''۔

© rasailojaraid.com